شاہد صدیقی کے کالموں میں ناسٹلجیا : تحقیقی و تنقیدی جائزہ

Nostalgia in Shahid Siddiqui's Columns: Research and Critical Review

[i] روبینہ کوثر [ii] ڈاکٹر طارق جاوید

Abstract:

Shahid Siddiqui is a researcher, critic, novelist, educationist and columnist. He has been associated with teaching for a long period of time and has held many prominent positions in different fields. Thus, Shahid Siddiqui is the writer of many books, but in the research under review, only Shahid Siddiqui's columns have been studied nostalgically. For this, not only columns and various books and articles written on nostalgia have been used, but the opinions of experts and critics have also been taken into consideration. Shahid Siddiqui's columns are published in Dunya News under the name "Zair-e-Aasmaan". Apart from this, he has been writing the editorial pages of prestigious English newspapers "Dawn" and "The News" for a long time. In this study Shahid Siddiqui's columns are examined considering the different types of nostalgia and to which type they belong. Nostalgia can be both good and bad. Excessive nostalgia becomes a psychotic illness. Shahid Siddiqui's nostalgia is not a mental illness. Its nostalgia creates a happy and literary phenomenon. Shahid Siddiqui highlights the memories of the past and leaves a positive and rich message to improve the present and the future. Mix methodology of research has been used during the study. The research has concluded that Shahid Siddiqui's columns simultaneously contain different types of nostalgia, with the dominant trend being a literary trend that creates a healthy society.

Keywords: *Shahid Siddiqui, Columns, Nostalgia, History, Remember, Literature, Past.*

شاہد صدیقی محقق ، نقاد ، ناول نگار ، ماہر تعلیم اور کالم نگار ہیں۔ ایک مدت سے درس و تدریس سے منسلک ہیں اور کئی ممتاز عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ یوں تو آپ کئی کتابوں کے خالق ہیں مگر زیر نظر تحقیق میں فقط ان کے کالموں کا ناسٹلجیائی مطالعہ مقصود ہے۔ اس کے لیے نہ صرف کالمز اور ناسٹلجیا پر لکھی گئیں مختلف کتب اور مضامین سے استفادہ کیا گیا ہے بلکہ ماہرین و ناقدین کی آرا کو بھی مقدم جانا گیا ہے۔ شاہد صدیقی کے کالمز دنیا نیوز میں "زیر آسماں" کے نام سے شایع ہو رہے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ ایک عرصے سے موقر انگریزی اخبارات "ڈان" اور "دی نیوز" کے ادارتی صفحات بھی لکھ رہے ہیں۔ اس مطالعے میں ناسٹلجیا کی مختلف اقسام کو مد نظر رکھتے ہوئے جائزہ لیا گیا ہے کہ شاہد صدیقی کے کالمز کس قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناسٹلجیا اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔ حد سے بڑھا ہوا ناسٹلجیا ایک نفسیاتی بیماری بن جاتا ہےمگر شاہد صدیقی کا ناسٹلجیا ایک نفسیاتی بیماری نہیں بلکہ ایک خوش گوار ادبی رجحان کے طور پر سامنے آیا ہے۔ آپ ماضی کی یادوں سے بھر پور لطف اٹھاتے ہوئے حال اور ماضی کو بہتر بنانے کے لیے ایک مثبت اور بھر پور پیغام چھوڑ جاتے ہیں۔ اس مطالعے میں دستاویزی تحقیق کی مبادیات استعمال کی گئی ہیں۔ تحقیق اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ شاہد صدیقی کے کالمز میں بیک وقت ناسٹلجیا کی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں جن میں غالب رجحان ایک ایسا ادبی رجحان ہے جو صحت مند معاشرے کی تشکیل کرتا ہے۔

کلیدی الفاظ: شاہد صدیقی ، کالم ، ناسٹلجیا ، تاریخ ، یاد ، ادب ، ماضی۔

شاہد صدیقی محقق، نقاد، ناول نگار، ماہرِ تعلیم اور کہنہ مشق کالم نگار ہیں۔ ایک مدت سے درس و تدریس کے ساتھ منسلک ہیں اور کئی ممتاز عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ ان دنوں لاہور سکول آف اکنامکس میں

[i] اسکالر ایم فل (اُردو)، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز ، اسلام آباد ، bina.pol.scientist@gmail.com
[ii] استاد ، شعبہ اقبالیات ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ، اسلام آباد ، tariq.benai@aiou.edu.pk (Corresponding Author)

اپنے فرائض منصبی سرانجام دے رہے ہیں۔ کئی کتابوں کے خالق ہیں مگر یہاں موضوع کی مناسبت سے فقط ان کی کالم نگاری کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ان کے کالم دنیا نیوز میں "زیرِ آسماں" کے عنوان سے چھپ رہے ہیں اور ان کے کالموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے ۲۰۲۰ء میں "زیرِ آسماں" کے نام سے اور دوسرا بک کارنر جہلم سے ۲۰۲۲ء میں "پوٹھوہار، خطۂ دل رُبا" کے نام سے شائع ہوا۔ علاوہ ازیں آپ ایک عرصے سے موقر انگریزی اخبارات "ڈان" اور "دی نیوز" کے ادارتی صفحات بھی لکھ رہے ہیں۔ اُردو اور انگریزی پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ یہ ماضی کی یادوں کو موجودہ دور کے ساتھ جوڑ کر قاری کے لیے ایسے سوالات چھوڑ جاتے ہیں کہ قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ماضی میں جھانکنے کی اس ادا کو ناسٹلجیا کہا جاتا ہے۔ ناسٹیلجیا کیا ہے؟ اس کی کتنی صورتیں ہیں؟ شاہد صدیقی کے کالم ناسٹیلجیا کی کون سی قسم سے متعلق ہیں؟ ان کا، ناسٹیلجیا فقط اپنے بچپن، بچپن کے دوست اور گھر کی سنہری یادوں تک محدود ہے یا اس کا دائرہ وطن، دھرتی اور اس دھرتی کے عظیم ہیروز تک پھیلا ہوا ہے؟ شاہد صدیقی کے کالم ایک عام آدمی کو کہاں تک متاثر کرتے ہیں؟ ان کے کالم ایک تندرست معاشرے کی تشکیل میں کس حد تک معاون ہیں؟ ادبی لحاظ سے ان کی کیا قدر و قیمت ہے؟ زیر نظر مقالے میں کالم نگاری کے تحلیل و تجزیے سے شاہد صدیقی کی کالم نگاری میں ناسٹیلجیائی کیفیت کو نمایاں کرتے ہوئے بطور کالم نگار ان کا مقام و مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔ شاہد صدیقی کے کالموں کا ناسٹالجیا کے حوالے سے جائزہ لینے سے قبل یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کالم نویسی اور ناسٹلجیا کیا ہے؟ کیا یہ ایک بیماری ہے یا اندازِ تحریر، کیا یہ کوئی نفسیاتی اثر ہے یا ادبی رجحان؟

کالم فرانسیسی زبان کے لفظ Coloumne اور لاطینی زبان کے لفظ Columna سے انگریزی زبان میں شامل ہوا۔ کالم (Column) کے لغوی معنی ستون، مینار، لاٹھ یا کھمبا کے ہیں۔ کسی چیز کی منظّم قطار کو بھی کالم ہی کہا جاتا ہے۔[۱] کالم سے مراد ایسا ستون یا ایسا سہارا جس کے دم پر کوئی عمارت کھڑی ہوتی ہے یعنی کالم ایک مضبوط ستون ہے۔[۲] اصطلاح میں کالم سے مراد حالاتِ حاضرہ یا گرد و پیش پر لکھی گئی ایسی تحریر جو اخبار میں مستقل عنوان کے تحت شایع ہوتی ہے۔[۳] کالموں کی ابتدا امریکہ سے ہوئی۔ نصف صدی قبل کالم کی صنف قریب قریب نایاب تھی مگر اب یہ اُردو صحافت کا جز لاینفک بن گئی ہے۔[۴] کالم نویس اپنی طرزِ تحریر میں منفرد اسلوب، نظریہ و خیالات کے ذریعے وقوع پزیر ہونے والے حالات و واقعات کی تشریح و توضیح کرتا

ہے۔ اس میں معاشرتی، سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل پر آواز اُٹھائی جاتی ہے اور رائے عامہ کو ہموار کر کے عوام میں شعور و آگہی پیدا کی جاتی ہے۔ کالم نویسوں کو دانشوروں اور صحافیوں کے اہم طبقے میں شمار کیا جاتا ہے۔ پروفیسر ظہور الدین کے مطابق اسی لیے امریکہ میں انھیں سیاسی پنڈت، قصیدہ گو، تیل چھڑک، چکر جُھولا، ہر فن مولا اور روشن دان ایسے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔[۵] کالم نگاری ایک معتبر پیشہ بن جانے کی وجہ سے اب نام ور لکھاری اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور کم و بیش ہر موضوع کالم کا حصہ بن رہا ہے۔ اس بُو قلمونی کی بدولت پروفیسر ظہور الدین نے اپنی کتاب "فنِ صحافت" میں کالم کی پانچ اقسام بیان کی ہیں مثلاً "رنگ بر نگا کالم"، "ذاتی کالم"، "مزاحیہ کالم"، "سٹڈی کیٹ کالم"، اور "خصوصی کالم"۔[۶] پروفیسر ظہورالدین کی بیان کردہ اقسام اور شاہد صدیقی کے کالموں میں موضوعات کے تنوع کے پیشِ نظر اسے "رنگ بر نگے" کالموں کی ذیل میں رکھا جا سکتا ہے مگر راقم کی نظر میں شاہد صدیقی کے کالموں کے لیے ایک بہترین اصطلاح "ادبی کالم" استعمال کی جا سکتی ہے۔

ناسٹلجیا (Nostalgia) سے مراد ماضی کی یادوں کے ساتھ جذباتی وابستگی ہے۔ ان یادوں کا تعلق ضروری نہیں ہے کہ قریبی رشتوں یا دوستوں کے ساتھ ہو۔ ان یادوں کا تعلق ہر اس شے، واقعے اور جگہ سے ہو سکتا ہے جس کے ساتھ ادیب کی وابستگی ہو۔ ناسٹلجیا کا مفہوم عمومی طور پر 'خانہ اداسی' سے لیا جاتا ہے مگر احمد سہیل کے نزدیک یہ بالکل غلط ہے کیوں کہ خانہ اداسی سے مراد Homesickness ہے نہ کہ ناسٹلجیا۔ ان کے نزدیک ناسٹلجیا جو بظاہر لاطینی لفظ معلوم ہوتا ہے دراصل دو یونانی الفاظ Nostos مطلب (Homecoming) 'گھر آنا' اور Algos مطلب (Pain, Ache) بمعنی درد یا تکلیف سے مل کر بنا ہے۔ گویا لفظی طور پر ناسٹلجیا کے معنی 'درد آلود واپسی' ہوگا۔ اس اعتبار سے لفظ ناسٹلجیا کو "پس کربیہ" بھی کہا جا سکتا ہے مگر یہ کرب ماضی کی جانب واپسی سے مشروط و منسوب ہوگا۔[۷] ناسٹلجیا کا لفظ پہلی بار سترہویں صدی میں استعمال ہوا۔ نیٹ پر موجود اردو ڈکشنری کے مطابق ناسٹلجیا کی تعریف یوں کی گئی ہے:

I. یادِ وطن کا عارضہ، وطن کی بیماری، وطن کی خُو جس کی شدت ایک مرض بن جائے۔
II. ایک قسم کا مالی خولیا جو عرصہ تک وطن سے دور رہنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔
III. ماضی کی حسرت ناک یادیں، ماضی کی یاد دلانے والی شے یا اشیاء۔ گھر کی یاد۔[۸]

اردو ڈکشنری کے مطابق ناسٹلجیا کا مطلب وطن پرستی اور وطن کی یاد میں کھویا رہنا ہے۔ یہ شروع تو ضرور وطن کی یاد میں سوئس (Swiss) فوجیوں سے ہوا مگر پھر اس کا دائرہ وطن سے جڑی ہر شے تک پھیل گیا۔ اب وطن، شہر، گاؤں، قصبوں، دیہاتوں، گلی کوچوں اور ان سے منسلک ہر چیز کی یاد ناسٹیلجیا کہلاتی ہے۔ گزرے زمانے کو شعور کا حصہ بنانے اور ماضی کے منتشر خیالات کی حسرتِ تعمیر و تشکیل "ناسٹلجیا" ہے۔ ناسٹلجیا کو اُردو کے نام ور طنز و مزاح نگار مشتاق یوسفی نے "ماضی تمانائی" کا نام بھی دیا ہے۔

مریم ویب اسٹر کے مطابق:

I. The state of being homesick,

II. A wistful or excessively sentimental yearing for return to or of some past period or irrecoverable condition.[9]

مختلف آراء کی روشنی میں ناسٹلجیا کی درج ذیل صورتیں سامنے آتی ہیں۔ اول "وطن واپسی کی خواہش"، دوم "یادِ ماضی"، سوم "نفسیاتی بیماری" اور چہارم "ادبی رجحان"۔ ناسٹلجیا کی پہلی صورت کے مطابق یادوں کا تعلق محض وطن کی یادوں سے ہے۔ جو لوگ اپنے وطن، اپنے شہر اور اپنی مٹی سے دور ہوتے ہیں وہ وطن کی یادوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ ان کے اندر وطن واپس جانے کی آرزو ہر امر سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ مسافر کہیں بھی جاتا ہے اپنے وطن کی یادوں کا سامان اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ میر تقی میر کی شاعری میں دہلی کی یادیں دکھائی دیتی ہیں۔ ناصر کاظمی انبالہ کے لیے تڑپتے نظر آتے ہیں۔ غلام عباس کا ناولٹ "گوندنی والا تکیہ" ہو یا غلام ثقلین نقوی کا ناول "میرا گاؤں" اپنے شہر، اپنے دیہات، اپنے کھیت کھلیان اور اپنے وطن کی بُو باس پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح شاہد صدیقی بھی اپنے گاؤں کی یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ وہ ہیمنگوے کا ناول Old main and The Sea پڑھتے ہوئے کبھی منیر نیازی کے اُن اشعار کی طرف چلے جاتے ہیں جن میں شجر، گاؤں اور بجلی سے بے نیاز گھروں کا ذکر ہے اور کبھی لالٹینوں کی مدھم روشنی میں ڈوبے اپنے گاؤں کے کچے گھروں کو یاد کرنے لگتے ہیں:

> "بالکل ایسا ہی گاؤں تھا میرا، جہاں گھر کم تھے اور دیے ان سے بھی کم لیکن آسماں کے اُفق بہت بڑے تھے۔ یا شاید مجھے ایسا لگتا تھا کیوں کہ اُس وقت میری عمر پانچ برس کی ہو گی۔ گاؤں کے مکان زیادہ تر کچے تھے۔ گاؤں میں اُس وقت بجلی نہیں پہنچی تھی۔ سرِ شام ہم

لالٹینوں کے شیشے صاف کرتے، لالٹینوں کا تیل چیک کرتے۔ کبھی کبھار لالٹین کا شیشہ لو تیز ہونے کی وجہ سے تڑخ جاتا۔"[۱۰]

ناسٹلجیا شروع تو وطن کی محبت سے ہوا لیکن رفتہ رفتہ اس کا دائرہ وطن سے جڑی ہر شے تک پھیل گیا اور پورے کا پورا ماضی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ ماضی کی یادوں سے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ یاد کا تعلق کس شے سے ہوگا۔ ماضی کے کسی بھی خوب صورت دریچے میں جھانکا جا سکتا ہے۔ ایک ادیب ماضی کے کسی بھی خوبصورت منظر میں گُم ہو سکتا ہے اور اپنے پرانے ساتھیوں کے ساتھ سکول یا کالج کی راہ داریوں میں بھٹک سکتا ہے۔ شاہد صدیقی بھی ماضی کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کبھی راول پنڈی کی بنک روڈ اور کبھی کالج روڈ پر نکل جاتے ہیں۔ کبھی لال حویلی اور کبھی لال کُرتی کو یاد کرتے ہیں۔ کبھی انھیں ماسٹر فضل اور کبھی سجاد شیخ کی یاد آتی ہے۔ کبھی ان کا دل اپنی والدہ کے لیے دھڑکتا ہے اور کبھی گاؤں کی سکینہ کے لیے۔ بقول شاہد صدیقی:

"یہ کتاب محض تحریروں کا مجموعہ نہیں بلکہ راول پنڈی اور پوٹھوہار سے میرے عشق کا احوال ہے۔ یہ ان گلی کوچوں، عمارتوں، قلعوں، حویلیوں اور دلبروں کی کہانیاں ہیں جو ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ یہ میری اپنی کہانی بھی ہے جو کبھی میرے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور کبھی بانسری کی لے کے تعاقب میں تاریخ کی گم گشتہ پگڈنڈیوں پر نکل جاتی ہے۔ پوٹھوہار اور راول پنڈی کے دلبروں کی فہرست طویل ہے۔ یہ بہادروں، صوفیوں، شاعروں اور مغنّیوں، جفاکشوں اور تخلیق کاروں کی سرزمین ہے۔ یہ پوٹھوہار کے ان سربستہ گوشوں کا احوال ہے جن کے طلسم نے مجھے اپنا اسیر بنا لیا اور انھیں دیکھنے کا تجسّس ایک نہ ختم ہونے والی تلاش میں بدل گیا۔ یہ تاریخ کی کتاب نہیں صرف ان منظروں کا بیان ہے جنھیں میری آنکھوں نے دیکھا اور جن کا لمس میری روح نے محسُوس کیا۔"[۱۱]

ناسٹلجیا کے بارے میں یہ بحث بھی عام ہے کہ کیا ناسٹلجیا ایک نفسیاتی بیماری ہے یا ایک صحت مند ادبی رجحان؟ ماضی کی یادیں اگر انسان کو حال میں عضو معطل بنا کر رکھ دیں تو یہ بیماری کہلائے گی۔ بسا اوقات لمحۂ موجود میں کسی بات کے تجزیہ و ردِ عمل کی قوت اس قدر کمزور اور پست ہو جاتی ہے کہ ذہن ماؤف ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر حال اور مستقبل کے درمیان ایک خلا سا پیدا ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ گزرے ہوئے

لمحوں کی یلغار اس قدر شدید ہوتی ہے کہ حال میں دیکھنے کی قوت ہی سلب ہو جاتی ہے۔ ہر چیز میں توازن اور اعتدال ہی نارمل زندگی کی علامت ہے۔ جب انسان ہر وقت ماضی کی یادوں میں کھویا رہتا ہے تو اعتدال و توازن کے بگڑنے سے کئی طرح کی نفسیاتی اُلجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ماضی میں رہ کر حال کے لیے تعمیری سوچ رکھی جائے اور ماضی کی اغلاط کو درست کرکے حال اور مستقبل بہتر کرنے کا رجحان ہو تو یہ بیماری نہیں بلکہ ایک خوش کن قدم ہو گا۔ ماضی میں جھانکیں تو اردو ادب میں ناسٹلجیا ایک صحت مند رومانوی اصطلاح تھی پھر ایک وقت آیا کہ اسے ایک نفسیاتی بگاڑ کے طور پر جانا جانے لگا۔ یہ دور سترھویں صدی کے لگ بھگ ہے۔ دراصل اُن دنوں گھر یا وطن سے دوری کو اس بیماری کا سبب جانا جاتا تھا مگر علمِ نفسیات نے اس صورتِ حال کو بدلا۔ جدید علوم کی روشنی میں Home Sickness اور ناسٹلجیا کو ایک دوسرے سے الگ سمجھا جانے لگا۔ علم کے دروازے مزید وا ہوئے تو معلوم ہوا کہ ناسٹلجیا اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔ کوئی اس سے جان چھڑانا چاہتا ہے تو کوئی اسے محبوب جان کر گلے لگاتا ہے اور اس سے بصیرت حاصل کرکے اپنے حال کو بہتر اور مستقبل کو خوش گوار بناتا ہے۔ یہاں اختر انصاری اور علامہ اقبال کو بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ اختر انصاری ماضی کی یادوں کو اذیت جان کر اس سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ایسے لمحات دوبارہ یادوں کے کینوس پر ابھریں:

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا[۱۲]

اس کے برعکس علامہ اقبال ماضی کے تجربات کو اہم جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک ماضی تو جذبات و احساسات کی تہذیب و ترویج کا مآخذ ہے۔ وہ اپنے شاندار ماضی پر فخر کرتے ہوئے نئی نسل کو بتاتے ہیں کہ کس طرح ان کے اسلاف نے ایران کے شاہی تاج کو پاؤں کے نیچے روند ڈالا تھا۔ انھوں نے عظیم الشان تہذیب پیدا کی اور دنیا کو حکمرانی کے قواعد سکھائے۔ وہ امیری کی سربلندیوں پر پہنچ کر بھی فقر ہی کو اپنے لیے فخر کا سامان سمجھتے تھے۔ اقبال نئی نسل کو باوقار و ثروت مند بنانے کے لیے ان کے سامنے شاندار ماضی کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ وہ ماضی کی بنیادوں پر حال اور مستقبل کی عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے ماضی کی یادوں کو سینے سے لگائے بڑے فخر سے کہتے ہیں:

میں کہ میری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سر گزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو[۱۳]

گویا ناسٹلجیا اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔ اس کا تعلق ہمارے زاویۂ نظر سے ہے کہ ہم ماضی کو کس رخ سے دیکھ رہے ہیں اور کس زاویے سے دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ماضی کے تلخ حقائق سے فراموشی چاہتے ہیں یا ان تلخ حقائق کو ایک سچ جان کر اس سے کوئی نئی بصیرت لیتے ہیں۔ ماضی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے کتنا اور کیسے لطف انداز ہونا ہے یہ ہر ایک کی طبعیت پر منحصر ہے۔ علامہ اقبال کی مانند شاہد صدیقی بھی اپنے ہیروز کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ان کے کالموں کی کتاب "زیرِ آسماں" میں ''ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ'' کے عنوان سے جو کالم نظر آتے ہیں وہ ہمارے بھولے ہوئے ماضی کو زندگی بخشتے ہیں۔ یہ اُن حریت پسندوں کی کہانیاں ہیں جنھوں نے برطانوی راج کے خلاف بھرپُور مزاحمت کی تھی۔ اس سلسلے میں "زیرِ آسماں" کے دیباچے میں فتح محمد ملک لکھتے ہیں کہ شاہد صدیقی نے برطانوی استبداد کے خلاف مزاحمت کے ان استعاروں میں جان ڈال دی ہے۔ سامراجی مقاصد کی تکمیل کی خاطر حریت پسندوں کے جن کارناموں کو نوجوان نسل سے مسلسل پردۂ راز میں رکھا گیا تھا انھیں وا کر کے شاہد صدیقی نے نوجوان نسل پر احسان کیا ہے۔[۱۴] شاہد صدیقی نے برطانوی سامراج کے خلاف جن مزاحمتی کرداروں کو بطور ہیرو پیش کیا، اُن میں دُلا بھٹی، مظفر خان، رائے احمد خان کھرل، شیر سنگھ، حاجی ترنگ زئی، سُلطان سارنگ خان، بھگت سنگھ جیسے نام نمایاں ہیں۔ شاہد صدیقی کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ ان بہادر جوانمردوں کی شجاعت اور قربانیوں پر وقت کی دُھول جم چکی ہے۔ ان کے کالم " جلیاں والا: پنجابی مزاحمت کا آخری مورچہ " کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "یہ درخت بھی یقیناً گواہ ہوں گے جب جنرل شیر سنگھ نے جنرل گف کی فوج کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا اور اس خیال کو غلط ثابت کیا تھا کہ فرنگی فوج ناقابلِ شکست ہے۔ بڑھ کے بوڑھے درخت سر جھکائے کھڑے ہیں۔ شاید وہ اور میں ایک ہی بات سوچ رہے ہیں۔ یہ تو فرنگیوں کی یادگاریں ہیں مگر ان خاک زادوں کی یادگاریں کہاں ہیں جو اس سرزمین سے اُٹھے اور جنھوں نے اپنے خون کا نذرانہ دے کر اپنی مٹی کی حفاظت کی تھی، وہ جو اپنی آنکھوں میں حریت کے خواب لے کر نکلے تھے اور بے نشاں راہوں میں کہیں

کھو گئے۔"[۱۵]

ناسٹلجیا منفی اور مثبت دونوں قسم کے اثرات مرتب کر سکتا ہے مگر اختر انصاری کے قریب اس کے مثبت اثرات اس کے منفی اثرات کی نسبت کہیں زیادہ ہیں۔[۱۶] ماضی کی اہمیت سے انکار کسی صورت ممکن نہیں۔ ماضی کو بُھول کر حال اور مستقبل کو بہتر نہیں کیا جا سکتا۔ ماضی کی اہمیت کے متعلق ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

"قوموں کا تہذیبی تشخص ان کی تاریخ اور افراد میں اور افراد کا تشخص ان کے ماضی میں پنہاں ہوتا ہے۔"[۱۷]

ناسٹلجیا سے متعلق ایک اہم سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ناسٹلجیا کوئی ادبی رجحان ہے؟ ادب کی ایک خاصیت یہ رہی ہے کہ اس میں مختلف ادبی رجحانات جنم لیتے رہے ہیں۔ یہ رجحان بعض صورتوں میں ایک مکمل تحریک یا دبستان کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ اسی طرح ناسٹلجیائی کیفیت کی تقلید بھی ایک ادبی رجحان ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی ادبی رجحان ہے اور یہ رجحان ہمیشہ سے ناقدینِ علم و ادب کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ناسٹلجیائی تحریریں محض مشرقی علم و ادب ہی میں نہیں ملتیں بلکہ مغرب کے بہت سے ادیب اس رجحان کے دلدادہ ہیں۔ بعض مغربی ادیبوں نے اسے ایک بیماری تصور کرتے ہوئے ماضی پرستی کے اس رجحان کی نفی بھی کی مگر عہدِ حاضر میں مشین کے سامنے انسان کی کم مائیگی اور بے وقعتی کے احساس نے انھیں پھر سے ناسٹلجیا کی طرف راغب کیا ہے۔ اس مشینی اور افراتفری کے دور میں انسان اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ خاص طور پر دوسری عالمی جنگ کی تباہی و بربادی کے بعد انسان اس تنہائی اور بے ثباتی کا خصوصی طور پر شکار ہوا ہے۔ اس دنیائے رنگ و بُو کو تین طرح سے تقسیم کر سکتے ہیں، اول "فطری دنیا" (Natural World) جس میں انسان، حیوان، نباتات، جمادات، سورج، چاند، ستارے سب کچھ شامل ہے۔ دوم "سوشل دنیا" (Social World) جس میں ایک گروہ، قوم یا نسل دوسرے گروہ یا گروہوں، قوموں اور نسلوں کے ساتھ مل جُل کر رہنے پر مجبور ہے، جس میں ایک قوم یا گروہ کی دوسری اقوام کے ساتھ سماجی، اقتصادی اور سیاسی ذمہ داریوں کے لیے اخلاقی ضابطے موجود ہیں اور جس میں سب کے رسوم و رواج اور عقائد و نظریات کا احترام شامل ہے۔ سوم "شخصی دنیا" (Personal World) جو ایک انسان

کی اپنی دنیا ہے جس میں وہ ہر طرح کی سوچ اور افعال میں آزاد ہے۔ اس میں انسان یہ سوال اُٹھانے میں آزاد ہے کہ میں کون ہوں؟ میرا آنے کا مقصد کیا ہے؟ میرا خدا اور اس کائنات کے ساتھ رشتہ کیا ہے" میں یہاں اپنے اعمال و افعال میں آزاد ہوں یا کسی قانون قاعدے کا پابند ہوں؟ اس "فطری دنیا" (Natural World) اور "سوشل دنیا" (Social World) میں میری حیثیت کیا ہے؟ اسی نوع کے متعدد سوالوں پر غور کرنے کے دو نتائج سامنے آئے۔ بعض نے اس وسیع و عریض کائنات کے سامنے خود کو کم تر پایا جب کہ بعض نے اپنے نفس اور اپنی ذات کے حقیقی ادراک سے اپنے اشرف المخلوقات ہونے کے منصب کو پہچانا۔ ہر دو صورتوں میں انسان نے اپنی ذات کو اہمیت دینا شروع کی۔ اپنی ذات اور اپنی ذات سے جڑے ہر رشتے کو معتبر جاننا شروع کیا۔ یہی بڑھتا ہوا رجحان ناسٹلجیا کی طرف ایک قدم تھا۔ اس سارے منظر نامے سے ہٹ کر اگر مشرقی ادب پر نظر دوڑائیں تو معلوم پڑتا ہے کہ شعراء و ادباء کی ایک کثیر تعداد نے ناسٹلجیا کو ایک مثبت ادبی رجحان کے طور پر قبول کیا ہے۔ اگر افسانوں کو دیکھیں تو کرشن چندر کا "پورے چاند کی رات، قرۃ العین حیدر کا "پت جھڑ کی آواز"، بلوت سنگھ کا "بابا مہنگا سنگھ" اور انتظار حسین کے متعدد افسانے ناسٹلجیائی کیفیت کے عکاس ہیں۔ اسی طرح میر تقی میر، مومن، ناصر کاظمی، بشیر بدر، احمد فراز، پروین شاکر، خورشید رضوی، نوشی گیلانی اور احمد مشتاق جیسے کتنے ہی قدیم و جدید شعراء کی شاعری میں ناسٹلجیا کے مختلف رنگ ملتے ہیں۔ ادب کی مختلف اصناف ناول، داستان، افسانہ، شاعری کے علاوہ فلموں اور ڈراموں میں ناسٹلجیا کی مختلف صورتیں بکثرت ملتی ہیں لیکن اگر کالموں پر نظر دوڑائیں تو ان میں ناسٹلجیائی رجحان کم ہی ملتا ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک خالص صحافتی نوعیت کی تحریر ہے اور زیادہ تر کالم نگار سیاسی و اقتصادی نقطۂ نظر سے عہدِ حاضر پر ہی توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ بہت کم ایسے کالم نگار ہیں جو ادبی شان و شوکت برقرار رکھتے ہوئے ہمیں ماضی کی وادیوں میں لے جاتے ہیں جہاں سے ہم بقدر طبع اپنا دامن خوش گوار یادوں سے بھرتے ہیں۔ ادبی کالم لکھنے والوں میں قیامِ پاکستان سے قبل خواجہ حسن نظامی، مولانا ظفر علی خان، عبدالمجید سالک، قاضی عبدالغفار، سر سید احمد خاں، چراغ حسن حسرت اور عبدالماجد دریاآبادی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد مشفق خواجہ، ابنِ انشا، یوسف ناظم، نصرت ظہیر، الطاف گوہر، احمد ندیم قاسمی، امجد اسلام امجد، عرفان صدیقی، عطاء الحق قاسمی، رضا علی عابدی، منو بھائی، اجمل نیازی، رؤف پاریکھ، جاوید چودھری، فاروق قیصر، مجیب الرحمان

شامی، ملیحہ لودھی، ناصر بشیر، اور یا مقبول جان اور پیر زادہ جیسے کتنے ہی نام قابلِ ذکر ہیں۔ کالم نگاروں کی اسی فہرست میں ایک نہایت اہم اور روشن نام شاہد صدیقی کا ہے۔ ان کے کالموں کا ایک ایک جملہ قارئین کے دل و دماغ کو معطر کرتا ہے۔ "زیرِ آسماں" اور "پوٹھوہار: خطۂ دِل رُبا" کے سارے ہی کالم دل بری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ "پوٹھوہار: خطۂ دِل رُبا" میں شامل ان کے ایک کالم "گلزار صاحب، بمبئی اور دینہ" سے یہ اقتباس دیکھیے:

> "آج گلزار کی گلی میں کھڑا سوچ رہا ہوں۔ یہاں سے جاتے وقت اس نے پلٹ کر آخری بار اپنی گلی کو دیکھا ہو گا۔ ایک آخری نظر جس کے بعد شاید وہ اسے کبھی نہ دیکھ سکے گا۔ اچانک مجھے خیال آتا ہے کہ میں گلزار کی گلی میں اس کے گھر کے سامنے کب سے تنہا کھڑا ہوں۔ دینہ میں اب رات گہری ہو چکی ہے۔ بوجھل قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف جاتے ہوئے میں سوچ رہا ہوں بچھڑے ہوئے راستوں پر جانے کی خواہش اپنی جگہ لیکن بچھڑے ہوئے راستوں کا سفر کتنا اداس اور تنہا کر دینے والا تجربہ ہے۔"[۱۸]

ناسٹلجیائی کیفیات کی حامل تحریروں کا مشاہدہ کرتے ہوئے ماہرین و ناقدین نے ان کی متعدد قسمیں بیان کی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاہد صدیقی کی تحریروں کا تعلق کون سی قسم سے ہے؟ ناسٹلجیا کی متعدد اقسام میں سے ناسٹلجیا کی ایک اساسی قسم Restorative Nostalgia ہے جس میں انسان ماضی کی یادوں کی بازیافت چاہتا ہے۔ نوید صادق کے نزدیک اس قسم میں زندگی میں بیتے لمحوں میں از سرِ نو گزر بسر کی خواہش زور کرنے لگتی ہے۔ گزرے ہوئے تجربات خواہ جیسے بھی تھے، ان سے دوبارہ گزرنے کی آرزو سر اٹھانے لگتی ہے۔[۱۹] جب انسان کو حال میں آسودگی دکھائی نہیں دیتی تو وہ اپنے احساسِ کمتری کو دُور کرنے کے لیے ماضی کے سنہری خوابوں میں پناہ لیتا ہے۔ حال میں ماضی کی بازیافت کئی ممتاز شعراء و ادباء میں نظر آتی ہے:۔

کچھ نہیں چاہیے تجھ سے اے میری عمرِ رواں
مجھ کو میرا بچپن، میرے جگنو، میری گُڑیا لادے[۲۰]

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے[۲۱]

خرد سے دُور غمِ تُند خُو میں اچھے تھے
اُسی جنوں میں، اُسی ہا و ہُو میں اچھے تھے
ہَوا ہوئی ہے موافق، ہمیں وہیں لے چل
سفینہ راں! ہم اُسی آبِ جُو میں اچھے تھے[۲۲]

اس میں ماضی کی بازیافت کی خواہش شدید ہوتی ہے اور اگر بازیافت نہ ہو سکے جو کہ بعض صورتوں میں ناممکن ہوتی ہے، تو انسان بہت سی الجھنوں کا شکار ہو کر نفسیاتی مریض بھی بن سکتا ہے۔ شاہد صدیقی کے کالموں کا عمیق مشاہدہ بتاتا ہے کہ انھیں ماضی سے لگاؤ تو ہے مگر ماضی کو حال میں کھینچنے کی کھینچا تانی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہد صدیقی کا ناسٹلجیا ایک بیمار ناسٹلجیا نہیں بلکہ ایک خوش گوار ادبی رجحان ہے۔ ایک معروف مصنف ایننن (Anon) کے مطابق ناسٹلجیا کی ایک قسم Reflective Nostalgia ہے جن کا تعلق ماضی کی ان مٹھی بھر یادوں سے ہوتا ہے جو خوشگوار اور ناگوار دونوں طرح کے اثرات رکھتی ہیں اور جو ہنسانے اور رلانے کا موجب بنتی ہیں لیکن ناسٹلجیا کی اس قسم میں آدمی یہ تسلیم کر لیتا ہے کہ گزرا ہوا زمانہ تو گزرا ہوا زمانہ ہے، اس کی بازیافت ممکن نہیں۔ پس اِنسان ماضی کے یادگار اور حسین واقعات کی بازیافت کی بجائے ان یادوں سے لطف اندوز ہونے کو ترجیح دیتا ہے۔[۲۳] شاہد صدیقی کی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ماضی کی یادوں کو اپنے لیے عذاب نہیں بنایا بلکہ ان سے ایک مثبت توانائی کشید کی ہے۔ اپنے کالم 'حرف تمنا' میں مانچسٹر کی یادوں کو اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ قاری خود کو مانچسٹر میں چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح کراچی میں گزارے ہوئے لمحات مصنف کی یادوں میں سمندر کی لہروں کی طرح تہ در تہ محفوظ ہیں۔ مصنف لہروں کے تھپیڑوں سے خود بھی لطف اندوز ہوتا ہے اور اپنے قارئین کو بھی محظوظ کرتا ہے۔ ترکی کے شہر استنبول کے بیان میں دل کو موہ لینے والی خطاطی اور نقش نگاری اور ہڑپہ کے کھنڈرات میں، گھر، گلی، پتھر، اناج کے برتن، پانی بھرنے کے کنویں اور شہر کے ارد گرد پھیلی فصیل کا احوال بہت دلچسپ ہے۔ راول پنڈی کی بنک روڈ ہو یا مال روڈ، گورڈن کالج ہو یا اصغر مال کالج، قلعہ روہتاس ہو یا ٹیکسلا، لال کُرتی ہو یا ڈھیری حسن آباد، وہ جس کا بھی تذکرہ کرتے ہیں اس احساس کے ساتھ کرتے ہیں کہ یہ ان کا ایک خوب صورت ماضی ہے اور بس یہ تسلیم کر لینا کہ ماضی تو ماضی ہے اس کی بازیافت ممکن نہیں، بذاتِ

خود ایک جمالیاتی احساس ہے جو لُطف و انبساط کا باعث بنتا ہے۔ یہ بالکل کسی سحر انگیز داستاں سُننے، کوئی اچھی کتاب پڑھنے یا ایک شاندار فلم دیکھنے کے مترادف ہے۔ شاہد صدیقی کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی آنکھوں کے جھروکوں سے ماضی میں دیکھتے ہوئے ایک مثبت توانائی کشید کرتے ہیں جس سے اُن کے قارئین بھی ایک گونہ مسرت حاصل کرتے ہیں۔ ان کے کالموں میں یہ ناسٹلجیائی منظر نامہ یا اس سے جُڑا احساس اپنے ہم عصر کالم نگاروں کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ یوں تو ماضی کے واقعات سے جڑی لُطف و انبساط کی یہ کیفیت کسی نہ کسی کالم نگار کے ہاں کہیں نہ کہیں مل ہی جاتی ہے لیکن شاہد صدیقی کے یہاں ماضی کی سنہری یادوں کا اظہار جس قدر رُومانوی انداز میں، جس شدت کے ساتھ ہوا ہے اُس کی نظیر خال خال ہی ملتی ہے۔ وہ اپنے کالموں میں ماضی کے واقعات کا اظہار ایسے پُر تاثیر انداز میں کرتے ہیں کہ اُن کا ماضی فقط اُن کا ماضی نہیں رہتا، اُن کے اپنے خاندان کا ماضی نہیں رہتا بلکہ پوری انسانیت کا ماضی بن جاتا ہے۔ اپنے کالم "آج بے طرح تیری یاد آئی" میں ماں کی ممتا کو ایسے جذباتی انداز میں بیان کیا ہے کہ ہم اُن کی ماں میں اپنی ماں کی صورت دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو ماں سے محبت کرتا ہے وہ ایک لمحے کے لیے اپنی ماں کے پیار کی گرمی ضرور محسوس کرتا ہے اور فرطِ جذبات سے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں:

> "سمت کا اندازہ کر کے میں چلتا گیا اور پھر ایک بوسیدہ درخت کے قریب مجھے ماں کی قبر مل گئی۔ قبر کی لوح، جہاں پر نام اور تاریخِ وفات درج تھے، گھاس میں چھپ گئی تھی۔ میں قبر کے پاس بیٹھ گیا اور گھاس کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹانے لگا، بالکل ویسے ہی جس طرح بچپن میں ماں میری پیشانی سے بال ہٹاتی تھی۔ وہ بھی کیا دن تھے۔ مجھے لمبے بال رکھنے کا شوق تھا۔ ایک دن والد صاحب نے اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں بال کٹوانے کا مشورہ دیا۔ اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، ماں نے کہا مجھے اس کے لمبے بال اچھے لگتے ہیں۔ والد صاحب یہ سن کر مسکرا دیے اور دوبارہ کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ میں آج بھی یہ واقعہ یاد کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ ماں نے میری خواہش کو اپنی خواہش بنا کر پیش کیا تھا۔"[۲۴]

اسٹرن (Stern) نے ناسٹلجیا کی دو قسمیں Personal Nostalgia اور Historical Nostalgia بیان کی ہیں۔[۲۵] Personal Nostalgia میں مصنف اپنی ذات کے خول سے باہر نہیں آتا اور Historical

Nostalgia میں اپنی مذہبی، ثقافتی، قومی و ملی تاریخ سے چمٹا رہتا ہے۔ شاہد صدیقی کے کالمز کا مطالعہ کریں تو ان کے کالمز میں متذکرہ دونوں قسمیں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک طرف تو مصنف اپنی ذات اور اپنی ذات سے متعلقہ رشتوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ انہوں نے اپنی والدہ، اپنے والد، بھائی انعام، اپنے دوستوں اور اپنے اساتذہ کرام ماسٹر فضل، خواجہ مسعود، سجاد شیخ اور آفتاب اقبال شمیم کا احوال محبت میں چُور ہو کر قلم بند کیا ہے۔ ان مقدس رشتوں کے اظہار میں مصنف جذبات کی انتہائی حد کو چُھو لیتے ہیں۔ اپنے کالم 'مری کی ایک شام' میں اپنے بھائی انعام کا ذکر کس جذبات سے کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

> "اس بوڑھے انگریز کی طرح جو ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں آیا تھا۔ اپنی بیٹی کو یہاں کا حُسن دکھانے کے لیے۔ ایسے ہی ایک بار انعام بھائی بھی مجھے اپنے ہمراہ یہاں لے آئے تھے۔ یہی جی پی او تھا۔ یہی سیڑھیاں، یہیں ہم تھک کر ستانے کے لیے بیٹھے تھے۔ ہم مال روڈ پر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ مال روڈ کے نشیب کی طرف جاتے ہوئے اچانک لوگ بادلوں میں گم ہو جاتے۔ انعام بھائی پانچ سال پہلے اسی وادیٔ اجل میں چلے گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ آج میں اکیلا یہاں بیٹھا تھا۔" [۲۶]

شاہد صدیقی نے اپنی ذات اور ذات سے جُڑے رشتوں کی مانند پوٹھوہار کی تاریخ کو بہت عمدگی کے ساتھ پینٹ کیا ہے۔ یہاں کی تاریخ کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اور اپنے دل کی زبان سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے راول پنڈی کی ان جگہوں کا ذکر نہایت محبت کے ساتھ کیا ہے جہاں اُن کا بچپن گزرا۔ ان میں لال کُرتی، ٹاہلی موری، مریڈ حسن، ڈھیری حسن آباد اور گوال منڈی شامل ہیں۔ اُن سڑکوں کا احوال دلچسپی اور اُلفت سے بیان کیا ہے جو اُن کی صبحوں اور شاموں کا حصہ تھیں مثلاً کالج روڈ، بنک روڈ، مال روڈ اور بارلے سٹریٹ وغیرہ۔ ان جگہوں اور عمارتوں کا ذکر نہایت دل فریب ہے جو ان کے لیے ہمیشہ باعثِ کشش رہیں مثلاً لال حویلی، مسجد سوجان سنگھ کی حویلی، لیاقت آباد، راول پنڈی کی قدیم تاریخی مساجد، سینما گھر اور بیکریاں وغیرہ۔ ان تعلیمی درس گاہوں کا تذکرہ عقیدت کے ساتھ کیا ہے جہاں وہ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوئے۔ ان میں لال کُرتی میں واقع سی بی پرائمری سکول، سی بی ٹیکنکل سکول، مال روڈ کا سرسید کالج، گارڈن کالج پھر گورنمنٹ کالج اصغر مال کا احوال جہاں اُنھیں بطور اُستاد پڑھانے کا موقع ملا۔ اسی طرح انھوں نے سلطان

سارنگ، رائے احمد کھرل، حاجی ترنگ زئی، کیپٹن سرور شہید، بھگت سنگھ، گلزار، سنیل دت، دلا بھٹی اور ان جیسے کئی ممتاز ہیروز کے قصوں کو اپنی جولانیٔ قلم سے پھر زندہ کر دیا۔ مصنف اپنے کالموں کے مجموعے "پوٹھوہار، خطۂ دِل رُبا" کے دیباچے میں خود لکھتے ہیں کہ یہ ان گلی کوچوں، عمارتوں، حویلیوں، قلعوں، دلبروں، بہادروں، مغنّیوں، شاعروں، صوفیوں، جفاکشوں، تخلیق کاروں اور پوٹھوہار کے ان سربستہ گوشوں کا احوال ہے جن کے طلسم نے انھیں اپنا اسیر کر رکھا ہے۔[۲۷] تاریخ کے ساتھ ان کا یہ فطری لگاؤ تاریخی ناسٹلجیا (Historical Nostalgia) کی علامت ہے۔ محمد اظہار الحق "زیرِ آسماں" کے فلیپ میں لکھتے ہیں:

> "میرا لڑکپن اور شباب بھی پوٹھوہار میں گزرا کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ پوٹھوہار اتنا دل نشیں تھا۔ لوگ نیویارک لندن اور استنبول پر کالم لکھتے ہیں۔ پیرس، فرینکفرٹ اور روم کو یاد کرتے ہیں۔ شاہد صدیقی نے اپنی گلیوں، اپنی عمارتوں، اپنے شہروں اور اپنے ہیروز پر لکھا اور یوں لکھا کہ آپ بیتی کو جگ بیتی کر دکھایا۔"[۲۸]

شخصی ناسٹلجیا (Personal Nostalgia) اور تاریخی ناسٹلجیا (Historical Nostalgia) کی علیحدہ علیحدہ شکلیں تو کسی بھی ادیب کی تحریر میں دیکھی جا سکتی ہیں مگر کسی ادیب کی تحریر میں بیک وقت ان دونوں صورتوں یعنی شخصی ناسٹلجیا (Personal Nostalgia) اور تاریخی ناسٹلجیا (Historical Nostalgia) کا جمع ہو جانا بڑے ارفع ادب کی علامت ہے۔ شاہد صدیقی کے ایسے بہت سے کالم ہیں جن میں ناسٹلجیا کی یہ دونوں صورتیں یکجا ہو گئی ہیں۔ زیرِ تذکرہ ان کے کالم "مری کی ایک شام"، ہی کو لیجیے جس میں مصنف مری، مری کے حسن اور وہاں آنے والے سیاحوں کے تذکرے کے ساتھ ہی اپنے بھائی انعام کو یاد کرنے لگتے ہیں جو داغِ مفارقت دے گیا ہے۔ کٹاس راج کے تالاب کے کنارے بیٹھے عہدِ ماضی میں چلے جاتے ہیں اور چشمِ تصور سے تالاب کو بھرا دیکھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اپنے ایک کالم میں اپنے بچپن کے متعلق بتاتے ہوئے کہ جب وہ سکول کے طالب علم تھے، شیخ عبد اللہ پاکستان کے دورہ پر آئے۔ یہ ۱۹۶۴ء کا سال تھا۔ یہ وہی سال تھا جب جواہر لال نہرو کا انتقال ہوا تھا۔ دیکھیے کس طرح اپنے بچپن کے احوال بتاتے ہوئے ہمیں تاریخ کے اوراق میں لے جاتے ہیں۔ لال حویلی ہو یا راول پنڈی کی بنک روڈ، کٹاس راج ہو یا قلعہ روہتاس۔ ٹیکسلا اور جولیاں کا بیان ہو یا کھیوڑہ میں گلابی نمک کی کان کا تذکرہ، شاہد صدیقی ایک صحافی یا مؤرخ کی طرح محض خارجی

حقائق پیش نہیں کرتے بلکہ وہ ان میں اپنے احساسات و جذبات بھی رکھ دیتے ہیں۔ داخل اور خارج کے اسی امتزاج سے ان کا تاریخی کالم شخصی کالم بن جاتا ہے جس میں شخصیت جھلکتی نظر آتی ہے۔ داخلیت اور خارجیت کے اس ملاپ کی بدولت یہ دعویٰ قطعاً بے بنیاد نہیں کہ ان کے کالموں میں شخصی ناسٹلجیا (Personal Nostalgia) اور تاریخی ناسٹلجیا (Historical Nostalgia) کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں۔

Holak & Havlen نے ناسٹلجیا کی مختلف اقسام میں سے کلچرل ناسٹلجیا (Cultural Nostalgia) کا ذکر بطورِ خاص کیا ہے۔ ان کے نزدیک اس قسم میں ادیب اپنے کلچر سے بے پناہ عقیدت و محبت کا دم بھرتا ہے۔[۲۹] اس حوالے سے دیکھیں تو شاہد صدیقی کو اپنی دھرتی اور اپنے کلچر سے ایک خاص لگاؤ ہے۔ قدیم تاریخی شہر ٹیکسلا اور جولیاں (جہاں دنیا کی قدیم یونیورسٹی کے آثار پائے جاتے ہیں) کا ذکر نہایت دل پذیر انداز میں کیا ہے۔ جہاں مہاتما بدھ کے پیروکاروں نے ایک عظیم و شان سٹوپا بنوایا تھا اس گاؤں "مانکیالہ" کی کہانی اور جہاں ستی کی محبت میں شیو کی آنکھ سے نکلنے والے آنسوؤں کی لڑی نے تالاب کی صورت اختیار کر لی اس تاریخی مقام کٹاس راج کا تذکرہ بھی شاندار ہے۔ سلطان سارنگ کے قلعہ روات اور دریائے سندھ کے کنارے پر تعمیر اٹک کے قلعہ کا احوال بھی دلنشیں ہے۔ تاجِ برطانیہ کے خلاف مری کے لوگوں کی مزاحمت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ کھیوڑہ کے مقام پر گلابی نمک جیسی نعمت کے تذکرے میں احساسِ تفاخر اُبھرتا ہے کہ یہ دنیا کی دوسری بڑی کان ہے۔ شاہد صدیقی نے اپنے تہذیبی و ثقافتی ورثے کو جس خوبصورتی سے بیان کیا ہے اس سے متاثر ہو کر معروف شاعر افتخار عارف یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ اس خطۂ جاں فزا کو مؤرخوں نے بہت نظر انداز کیا ہے مگر شاہد صدیقی نے جس طرح تواتر کے ساتھ اس کے شب چراغوں کے تذکرے کیے اور ان کے بیک ڈراپ میں تاریخی تہذیبی ثروت مندی کا ذکر کیا، اس سے کالموں پر مشتمل عمدہ بیانیہ کی یہ کتاب "پوٹھوہار، خطۂ دِل رُبا" سب کے لیے دستاویز کی صورت ہو گی۔[۳۰] شاہد صدیقی نے کٹاس راج کا ذکر کس خوبصورت پیرائے میں کیا ہے، ملاحظہ کیجیے:

> "میں کٹاس راج کے آسمان پر نگاہ ڈالتا ہوں اور سوچتا ہوں یہی آسمان ہو گا جس کے نیچے علمی محفلیں برپا ہوتی ہوں گی۔ جہاں پہیلیاں بوجھنے کے مقابلے ہوتے ہوں گے۔ جہاں کی یونیورسٹی میں کتنے ہی طالبانِ علم کی پیاس بجھتی ہو گی۔ مجھے یوں لگا کٹاس راج میں

ہزاروں سال کی تاریخ سانس لے رہی ہے۔ شیو مہاراج کی بارہ دری کے عین نیچے میں
تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھا ان سانسوں کو محسوس کر رہا ہوں۔" [۳۱]

شاہد صدیقی کلچر کو خالص کلچر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس میں وہ مذہب کی تقسیم نہیں کرتے "اپنے ایک کالم "کٹاس راج اور آنسوؤں کا تالاب" میں اپنے ایک دکھ کا اظہار کرتے ہیں کہ کٹاس راج کا تاریخی ورثہ حکومتوں کی بے حسی کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ سیمنٹ فیکٹریوں نے یہاں کے شفاف تالاب کو بُری طرح متاثر کر رکھا ہے۔ یہاں پر قابلِ غور بات یہ ہے کہ کٹاس راج مسلمانوں کا مقدس مقام نہیں لیکن شاہد صدیقی کے دل میں پھر بھی ایک تڑپ ہے کہ کٹاس راج کا یہ تاریخی تالاب تازہ پانی کی عدم دستیابی کی وجہ سے کیوں متاثر ہو رہا ہے؟ اور پھر جب سپریم کورٹ کے ایک حکم کے مطابق کٹاس راج کے تالاب کے لیے پانی کا مناسب بندوبست کرنے کے احکامات جاری کیے گئے تو اس پر انھوں قدرے اطمینان کا اظہار بھی کیا۔ بھگت سنگھ اور شیر سنگھ کی بہادری بھی انھیں اتنی ہی پسند ہے جتنی کیپٹن سرور شہید کی۔ مینا کماری، گلزار اور سنیل دت کے لیے بھی ان کے پاس وہی خوبصورت الفاظ ہیں جو فتح محمد ملک اور آفتاب اقبال شمیم کے لیے ہیں۔ مانکیالہ کے سٹوپا اور ٹیکسلا کے قدیم کھنڈرات بھی اُن کے لیے وہی کشش رکھتے ہیں جس طرح راول پنڈی کی لال کُرتی اور قدیم تاریخی جامع مسجد۔ وہ رنگ و نسل، ذات پات اور مذہب کی تفریق کے بغیر کلچر کو پسند کرتے ہیں۔ کلچر سے یہی بے پناہ محبت Cultural Nostalgia کی علامت ہے۔

شاہد احمد صدیقی کے نام پر ناسٹلجیا کی کسی ایک قسم کا لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے رنگ برنگے کالموں میں موضوعات کا تنوع ہے۔ کبھی وہ اپنے قریبی عزیزوں پر لکھتے ہیں تو کبھی اپنے ہیروز پر۔ کبھی ان کا موضوع جغرافیائی کالم ہوتے ہیں تو کبھی تاریخی۔ کبھی اقتصاد پر لکھتے ہیں تو کبھی تعلیمی پالیسیوں پر۔ ان کے کالموں کا کینوس نہایت وسیع ہے۔ کسی بھی موضوع پر لکھے گئے ان کے کالموں کے اندر ادب کی شان و شوکت قائم رہتی ہے جس کی وجہ سے ان کے کالم خواص و عوام میں یکساں مقبول ہیں۔ تحقیق اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ شاہد صدیقی کے کالموں میں بیک وقت ناسٹلجیا کی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں جن میں غالب رجحان ایک ایسا ادبی رجحان ہے جو صحت مند معاشرے کی تشکیل کرتا ہے اور جس کی بنا پر ان کا نام ادبی کالم نگاروں کی کہکشاں میں ایک روشن تارے کی حیثیت سے ہمیشہ قائم رہے گا۔

حوالہ جات:

۱. خالد محمود عالی، اردو صحافت تاریخ و فن (لاہور: نیو یارک پبلس، ۲۰۱۳ء)، ۹۱۔

۲. ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ، رہنمائے صحافت (لاہور: مجید بک ڈپو، ۲۰۱۲ء)، ۲۳۔

۳. پروفیسر ظہور الدین، فن صحافت (نئی دہلی: انٹر نیشنل اردو پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء)، ۷۳۔

۴. ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ''اردو صحافت، ۱۸۵۷ سے ۱۹۶۲ء تک''، مشمولہ: نقوش (لاہور: ناقص الطرفین)، ۸۵۲۔

۵. پروفیسر ظہور الدین، فن صحافت، ۷۲۔

۶. ایضاً، ۷۶۔

۷. احمد سہیل، ''اردو افسانے کا ناسٹلجیا''، مشمولہ: سہ ماہی ذہن جدید (نئی دہلی: جون تا اگست ۱۹۹۴ء)، ۳۵۔

8. *Oxford Dictionary of English* (London: Oxford University Press, 1986),193.

9. www.*merriam.webster*.com

۱۰. ڈاکٹر شاہد صدیقی، زیرِ آسماں (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)، ۲۱۔

۱۱. شاہد صدیقی، پوٹھوہار: خطہ، دل رُبا (جہلم: بک کارنر، ۲۰۲۲ء)، ۱۴۔

۱۲. اختر انصاری، انتخاب کلام اختر انصاری (نئی دہلی: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۹۷ء)، ۷۶۔

۱۳. علامہ اقبال، بالِ جبریل (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۲ء)، ۱۱۶۔

۱۴. فتح محمد ملک، ''دیباچہ''، مشمولہ زیرِ آسماں، ڈاکٹر شاہد صدیقی (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)، ۹۔

۱۵. ڈاکٹر شاہد صدیقی، زیرِ آسماں، ۱۰۵-۱۰۶۔

۱۶. اختر حسین، ''ناصر کاظمی کی شاعری میں ناسٹلجیا''، مشمولہ زمانہ (کان پور: ۱۹۸۷ء)، ۵۶۔

۱۷. ڈاکٹر رئیس قمر، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ (علی گڑھ: سید بک ڈپو، ۱۹۶۳ء)، ۵۱۔

۱۸. شاہد صدیقی، پوٹھوہار: خطہ، دل رُبا، ۲۱۱۔

۱۹. نوید صادق "خورشید رضوی کا ناسٹلجیا" اپریل ۱۶، ۲۰۲۰ء۔

۲۰. نوشی گیلانی، محبتیں جب شمار کرنا، انتخاب (گوجرانوالہ: پبلشنگ کلب، ۲۰۱۰ء)، ۲۶۔

۲۱. مرزا اسداللہ خان غالب، دیوانِ غالب (دہلی: غالب اکیڈمی، ۲۰۰۷ء)، ۸۷۔

۲۲. خورشید رضوی، شاخِ تنہا (اسلام آباد: میل بکس اکیڈمی، ۱۹۸۷ء)، ۳۸۔

23. Crescent Park Anon, *Nostalgia, Reflective or Restorative*, Retrieved at August 15, 2019.

۲۴. ڈاکٹر شاہد صدیقی، زیرِ آسماں، ۱۳۔

25. Aoron Marcus Stern, *Design, User Experience and usability* (Inc: Aoron Marcus and Associates Inc. USA), 666.

۲۶. ڈاکٹر شاہد صدیقی، زیرِ آسماں، ۳۲۔

۲۷. شاہد صدیقی، پوٹھوہار: خطہ دل رُبا، ۱۴۔

۲۸. محمد اظہار الحق، "فلیپ"، مشمولہ زیرِ آسماں، از: شاہد صدیقی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)۔

29. Holak & William, Havlena, *Nostalgia: An Exploraatory Study of Thems and Emotions in the Nostalgic Experience*, Volume 19 (1992), 378-380.

۳۰. افتخار عارف، "فلیپ"، مشمولہ: پوٹھوہار ، خطہ دِل رُبا، از: شاہد صدیقی، محولہ بالا۔

۳۱. شاہد صدیقی، پوٹھوہار: خطہ دل رُبا، ۳۰۶۔